

تعارف

ہم ذیل میں حاتم بازبان کے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ صاحب مضمون نے ترک بغاوت کو ایک وسیع تر اور بین التہذیب تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ بیسویں صدی کے ترک معاشرے میں سیاسی جدوجہد کی طبقاتی شناخت کا ذکر کرتے ہوئے اس میں سیکولرزم اور اسلام کے رول کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ترکی میں سیکولرزم اپنے قیام کے لیے جس طرح سے مغرب کے تہذیبی اور سیاسی وسائل کا محتاج رہا ہے، اور اس نے ریاستی طاقت کے ذریعے ترک معاشرے کو جس طرح سے مسخ کیا ہے، اس کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ترک معاشرے کی سیاسی جدلیات میں طبقاتی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اسلام اور سیکولرزم کی کشمکش پر گفتگو بے معنی ہے۔ سیکولرزم روایتی فرمانروا سیکولر طبقے، ریاست، فوج اور ان کے استعماری سرپرستوں کے غلبے اور جبر کی قوتوں کا ورلڈ ویو ہے۔ جبکہ محکوم و مقہور اور نچلے طبقات نے اپنی سیاسی جدوجہد کی توسیع کے لیے اسلام کو انتخاب کیا۔ ہم عصر تاریخ میں مسلم دنیا کے کئی حصوں میں مذہب استعماری سرپرستی میں قائم کچھ ریاستوں کا آلہ کار اور بسا اوقات دہشت گرد تنظیموں کی آئیڈیالوجی کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ترکی کے پسماندہ اور معاشی طور پر محروم طبقات کی طرف سے اپنی سیاسی جدوجہد کی توسیع کے لیے اسلام کو لائحہ عمل بنا کر ایک خوشحال معاشرے کی طرف پیش قدمی کرنا ہم عصر دنیا میں ایک بالکل نئی چیز ہے اور بدلے ہوئے حالات میں فکری تجزیے کی متقاضی ہے۔

ترک فوج کی بغاوت اور اس کی ناکامی بنیادی طور پر سیکولر ریاست، فوج، مقتدر طبقے اور ان کے سرپرست مغربی استعمار کی زبردست شکست ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا استعمار اور اس کے حلیفوں کی ذلت آمیز شکست ترک قوم اور مسلم معاشرے کی دیرپا فتح میں تبدیل ہو سکتی ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ اگر فوجی بغاوت کے جواب میں سامنے آنے والی ترک معاشرے کی سیاسی وحدت اور قومی یکجہتی دیرپا ثابت ہوئی تو اس فتح کے ثمرات تاریخی نوعیت کے حامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات کسی حد تک یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس بغاوت کی ناکامی سے مشرق وسطیٰ اور کاکیشیا میں قائم طاقت کا نظام اپنی پرانی حالت میں برقرار رہنا مشکل ہے۔ روس اور نیٹو کے مابین رسہ کشی میں امریکی ایجنڈے کو سخت مشکلات لاحق ہونے کا امکان بہت واضح ہے۔

حاتم بازبان کے اس تجزیے میں سامنے آنے والی علمی اور فکری سطح اور اس میں ظاہر ہونے والا سیاسی ادراک پاکستانی صحافت کے نقار خانے میں عنقا ہے۔ قومی سطح پر درست اور بامعنی سیاسی عمل گہرے سیاسی ادراک کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ناکام بغاوت کے بعد ترک صحافت میں سامنے آنے والے سیاسی تجزیوں سے ان کے گہرے سیاسی ادراک کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جو مغربی پس خورد پر پلنے والی پاکستانی صحافت کے لیے سبق آموز ہے۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال یہ مضمون ہے۔

محمد دین جوہر

*

فوجی بغاوتیں اور استعماریات

حاتم بازیان / ترجمہ: طارق محمود ہاشمی

مسئلہ کی اصل بنیاد ترکی کی یہ کوشش ہے کہ معاشرے میں اسلام کے فطری کردار کو بحال کیا جائے۔ ماضی اور حال کی فوجی بغاوتیں اسی عمل میں رخنہ ڈالنے کے لئے کی جاتی رہی ہیں۔

ترکی میں حالیہ فوجی بغاوت کی ناکامی، پس استعماری دور کے ایک ہلاکت خیز رجحان کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہے۔ فوجی مداخلت اور بغاوت پس استعماری ریاست کا مستقل خاصہ ہیں۔ اگرچہ ترکی کو استعمار کا براہ راست تجربہ نہیں رہا، لیکن یورپ مرکز ڈسکورس اور پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کی طرف جھکاؤ نے ترکی پر اپنے اثرات بہر حال چھوڑے ہیں۔ بد قسمتی سے انہی اثرات نے فوجی مداخلت اور بغاوت کی صورت میں ایک مخصوص پس استعماری روایت کو جنم دیا ہے تاکہ معاشرے کے فطری نشوونما کی راہ مسدود کی جاسکے۔

مغرب کی جانب ترکی کے اس سفر کی پشتیبان اور نگران ایک سخت گیر فوج تھی۔ اس فوج نے ہر اس اقدام کی مزاحمت کی جو اس اس سفر کا رخ تبدیل کر سکے، یا اس رخ پر سفر کرنے کی اہمیت کو گھٹا سکے، یا عہد اسلامی کے اُس ماضی بعید سے از سر نو تعلق پیدا کرنے کی طرف مائل ہو، جسے بعد میں پیچیدہ اور ناممکن العمل بتایا جا رہا تھا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ترکی کے متوسط اور مزدور طبقے کو سیاسی نظام میں جگہ پانے کے لئے ایک طویل جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ ایک ایسے ملک میں، جہاں فوج ان طبقات کو سیاسی نظام میں جگہ دینے کے عمل میں مسلسل رکاوٹ ڈالتی رہی ہے، اس طبقے کی جدوجہد قابل تحسین ہے۔ درحقیقت جدید ترک ریاست کے قیام کے وقت ہی فوج نے، اور ہر دم یورپ کی طرف دیکھنے والی اشرافیہ نے، اسلام اور اس کے معاشرتی مظاہر سے ایک مخاصمانہ تعلق کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس رویے نے غریب اور متوسط طبقات کو (سیاسی نظام) سے بے دخل کر دیا۔ یہی طبقے مذہب کی طرف مائل ترکوں کی غالب اکثریت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ماڈرن اور مغرب پسند ہونے کا مطلب یہ سمجھا جانے لگا کہ آپ اسلام سے کتنے دور ہیں؛ اور اسلام سے اپنی پر خاش و کدورت کا اظہار کتنی بے باکی سے کرتے ہیں؛ معاشرے سے اسلام کی مکمل بے دخلی کی کوششوں میں مغرب زدہ اشرافیہ اور سیکولر فوج کا کہاں تک ساتھ دیتے ہیں؟

سرد جنگ نے جدید ترک ریاست کے فطری ارتقاء کو مزید پیچیدہ بنا دیا۔ سرد جنگ کے وجہ سے تمام اندرونی اور بیرونی قوتیں کیمونزم کے خلاف جنگ جیتنے کے مقصد میں جُت گئیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سرد جنگ کے دوران نہ صرف علاقائی سطح پر، بلکہ ترکی کے اندر بھی، اسلام کو ایک حد تک گوارا کرنے کا رویہ سامنے آیا۔ مگر یہ کوئی مستقل علمی پوزیشن نہیں تھی بلکہ یہ کیمونزم کا مقابلہ کرنے کا

ایک ذریعہ تھا۔ فوج اور یورپ کی دلدادہ اشرفیہ نے پے درپے ایسے اقدامات اٹھائے، جن کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی اقدار کسی بھی طرح ترک معاشرے میں شامل نہ ہو پائیں، اور کہیں ان کا حقیقی اظہار نہ ہونے لگے۔ اس طرح انہوں نے اپنی ہی زمین اور وطن میں ایک غیریت (otherness) کی بنیاد رکھ دی۔

یہی وجہ ہے کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد فوج نے اُن افراد اور اداروں کے انکار اور ان سے عداوت کو آئینی طور پر بحال رکھا جو جرأت کے ساتھ، دنیا کو اسلامی اقدار کی نظر سے دیکھنے پر مصر تھے۔ فوج نے اپنے آپ کو سیکولرزم کی ایک انتہا پسندانہ شکل کا محافظ قرار دیا، (ملی و دینی) ماضی سے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی کسی بھی سعی کو ہمیشہ شدت سے دبا یا، اور اسے ہر قیمت پر قوت سے روکا۔ فوجی بغاوتوں کا علم اسی مقصد سے اٹھایا گیا۔ فوجی قوت کے اس استعمال میں اکثر امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کا تعاون شامل رہا ہے۔ کرہ ارض کا جنوب عملاً (مغرب) کی ایک نوآبادی بنا ہوا ہے۔ وہاں فوجی بغاوتوں کا وقوع ایک عمومی قاعدہ ہے۔ عام رائے کے برعکس، فوجی بغاوت کسی ملک کے لوگوں کی سیاسی نااہلی کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تو پس استعمار قائم کردہ نظام کا ایک لازمی حصہ ہے جو ان ممالک پر کنٹرول قائم رکھنے کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

اس میں کیا شک ہے کہ استعمار جن ریاستوں کو اپنا شکار بنالیتا تھا، وہاں اس کی توجہ اس امر پر ہوتی تھی کہ وہاں ایک استعماری سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، اور مذہبی نظام قائم ہو، اور تشدد کے ذریعے ان مقبوضہ علاقوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھے۔ فوجی طاقت کا خاصہ ہی یہ تھا کہ وہ نظم برقرار رکھنے اور مقامی لوگوں کو مکمل کنٹرول میں رکھنے میں مفید مطلب تھی۔ استعمار کو کچھ مقامی آبادی کے لوگ بھی فوج میں بھرتی کرنے پڑتے تھے۔ ان مقامی فوجیوں کو کچھ دیگر مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مثلاً انہیں داخلی پولیس کے طور پر کام میں لایا جاتا تھا۔ پھر یہی مقامی فوجی استعمار کے انتظامی ڈھانچے میں، عوام اور غیر ملکی آقاؤں کے درمیان ایک بیچ کے آدمی (middleman) کے طور پر بھی فرائض انجام دیتی تھیں۔

اپنی اصل کے اعتبار سے، پس استعماری ریاست فی الحقیقت ایک استعماری ریاست ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں جارح ملک کی فوج قابض نہیں ہوتی۔ (اس کمی کو پورا کرنے کے لئے) استعماری طاقتوں نے ان ریاستوں میں ایک نئی اشرفیہ قائم کی جو ایسی پالیسیاں بناتی ہے، جو یورپی "مادروطن" (برطانیہ، فرانس، جرمنی وغیرہ) کے مفادات کو، باحسن پورا کر سکیں، اور اس اہم بات یہ ہے کہ اس کام کو (سیاسی) آزادی کے بعد بھی جاری رکھیں۔ استعمار نے "آزاد ریاست" کو اور اس کی معیشت اور اداروں کو، مغرب کے فائدے ہی کی خاطر گود کھلایا اور پالا ہے۔ لازم ہے کہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ استعمار نے معاشرے کو ہر پہلو سے۔ یعنی سیاسی، معاشی، تعلیمی، اور مذہبی اعتبار سے۔ برابر متاثر کیا ہے۔ اس حیثیت میں، استعماری دور میں فوج کا کردار یہ تھا کہ نظم و ضبط قائم رکھا جائے، اور یہ کردار پس استعمار دور میں نہ صرف قائم رہا، بلکہ مزید پھیل گیا۔

فوجی بغاوتیں اور عسکری مداخلت پس استعماری ریاست کو ابدی ماتحتی میں رکھنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ ان بغاوتوں کا مقصد یہ بھی تھا کہ پس استعماری ریاست، مغرب کے حلقہ اثر سے کبھی باہر نہ نکلے پائے۔ اگر ہم ریاست کو ایک فرد پر قیاس کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پیدائش سے بلوغت اور پھر بڑھاپے تک سفر کرتی ہے۔ اس منظر نامہ میں بغاوتیں اور فوجی مداخلتیں اس لئے کرائی جاتی ہیں تاکہ پس استعماری ریاست کو عہد طفولیت سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ اس طرح یہ ریاست ہمیشہ کے لئے مغرب پر منحصر رہے گی۔ مغرب ہی اس ریاست کی نگرانی کرے گی۔ گویا وہی ایک عاقل و بالغ فرد ہے جو اس طفل کی نگرانی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہے!

فوجی بغاوت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ فطری سیاسی عمل کو معطل کر دے، تاکہ پس استعمار معاشرے میں موجود مختلف طاقتوں کے داخلی تضادات رفع نہ ہو سکیں۔ ہر فوجی بغاوت کامیابی سے ملک کو اس سابقہ حالت کی طرف لوٹا دیتی ہے، جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا۔ فوجی بغاوت، اس پس استعماری غالب اشرافیہ کو، موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ بین الاقوامی استعماری آقاؤں کو دعوت دیں، کہ وہ ایک مختلف سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، معاشی، تعلیمی اور مذہبی ترقیاتی پروگرام بنا کر اس ملک میں نافذ کریں۔

ترکی میں آج کئی تحریکیں جاری ہیں: جمہوریت کی طرف پیش قدمی، معاشی سمت بندی، اور ایک نئی اور مختلف اشرافیہ کی تعمیر کی کوششیں: ایک ایسی اشرافیہ، جو مغربی یونیورسل ازم کے زیر اثر نہ ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلام مخالف ریاست، اور سیکولر فوج کے اثرات سے نکال کر، لوگوں کے شعور کی تشکیل نو کس طرح کی جائے اگر جدید قومی ریاست کی پیدائش ہی کے وقت ترک قوم کو اسلام دشمنی گھٹی میں پلائی گئی ہو، اور اسلام دشمنی ہی کو ترک قوم پرستی کی بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہو؟ تاہم ترک کے ڈسکورس میں سیکولر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ریاست اپنے سیاسی، معاشرتی، اور معاشی پالیسیوں میں اسلام کی مخالف ہو اور یہ مخالفت عیاں ہو۔ یہ عمل صرف مسجد اور ریاست کی علیحدگی تک محدود نہ ہو۔ ترکی میں مذہب کو ریاست سے بے دخل کرنے کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو اسلام سے اس حد تک دور کر دیا جائے کہ یہ دین ان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اقدار اور اخلاقی کردار کا منبع نہ رہے۔

دوسری طرف سرد جنگ کے بعد مسلم دنیا کے بہت سے حصوں میں ایسی نئی اشرافیہ وجود پزیر ہوئی ہے جو یورپ مرکز سوچ کے زیر بار نہیں ہے۔ یہ اشرافیہ یورپ کے طرز عمل کی نقالی کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد نہیں سمجھتی۔ مسلم دانشوروں کی یہ نئی کلاس نوجوان ہے۔ اس کی اکثریت پچیس سے پچاس برس کی ہے۔ یہ لوگ اپنی مسلم روایت کے علاوہ یورپی تاریخ کا گہرا مطالعہ بھی رکھتے ہیں۔ ترکی کی نئی اشرافیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور عصری علمی رجحانات سے روشناس ہے۔ یہ طبقہ باہر کی دنیا سے لا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس روایتی استشراتی بیان بازی سے خاموش نہیں کرایا جاسکتا۔ یہ استشراتی پروپیگنڈا "تھنک ٹینکس" کے سربراہان کے کام میں نمایاں ہے۔ ترکی میں ہونے والی بغاوت کے ابتدائی چند گھنٹوں میں مغرب کے تھنک ٹینکس کے

متعلقین نے جو رد عمل ظاہر کیا وہ بہت ہی چشم کشا تھا: یہ لوگ اس بغاوت میں اس اُمید کی کرنیں دیکھ رہے تھے کہ ایک مرتبہ پھر تاریخ کو پیچھے لے جایا جائے گا، اور ایک بار پھر ان کی پالتو (مغرب زدہ) اشرافیہ طاقت پر قبضہ کر لے گی۔

ترکی کی موجودہ قیادت ملک میں بہت اہم اور مثبت تبدیلیاں لائی ہے۔ سب سے نمایاں اور اہم بات یہ ہے کہ اس نے معاشی ترقی کی ہے، جس کے ثمرات کا مرکز اور رخ متوسط اور غریب طبقات کی طرف ہے۔ اس نے علم کے حصول کو آسان بنایا ہے اور ستر سے زائد نئی جامعات اور کالج کھولے ہیں۔ اس طرح ان ترکوں کو علم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، جو کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اس سے قبل ملک کے تعلیمی اداروں کے سامنے کھڑے ہو کر ایک تصویر ہی کھینچا لیں۔ نیز، موجودہ قیادت نے ریاستی اداروں میں اہم عہدوں پر تعیناتی کے عمل میں میرٹ اور اہلیت پر زور دیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس حکومت کے نتیجے میں لوگ اس قابل ہو گئے کہ اپنی اسلامی روایت کا کھلے عام اظہار کر سکیں۔

میں جانتا ہوں کہ ترکی کی سول قیادت کو یہ اندیشہ لاحق رہا ہے کہ ان کے خلاف ایک فوجی بغاوت ہو سکتی ہے۔ وہ پیہم اس پر غور و فکر کرتی رہی ہے کہ اس خطرے سے کیسے نبرد آزما ہو۔ یہی خدشہ ان کے داخلی تناؤ کی بنیاد رہی ہے، اور اسی تشویش نے ان کے عمل اور رد عمل کی صورت گری کی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ فوجی بغاوت کے خوف نے انہیں دیوانہ کر دیا ہے۔ مگر جو لوگ پس استعماری نظام کی حقیقت جانتے ہیں اور اس سے باخبر ہیں کہ امریکہ اور یورپ جنوبی خطے کے معاملات میں مسلسل مداخلت کرتے رہتے ہیں۔ حالیہ بغاوت اور اس کی ناکامی سے انہیں بھی یہ درس ملا ہے کہ کیا کياشے داؤ پر لگی ہوئی ہے۔

ترکی کی تاریخ کا ایک وسیع تر تناظر ہے، اور یہ اس دور کو محیط ہے جب پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلام کو معاشرے سے بے دخل کیا گیا، اور اسلام کو ایک "مسئلہ" بنا کر پیش کیا گیا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے ایک سو برس بعد، ترکی میں ہونے والی یہ فوجی بغاوت کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ اصل قضیہ ترکی کی یہ کوشش ہے کہ معاشرے میں اسلام کے فطری کردار کو بحال کیا جائے۔ ماضی اور حال کی فوجی بغاوتیں اسی عمل میں رخنہ اندازی کے لئے کی جاتی رہی ہیں۔ یقیناً ایک طویل الموقتی تناظر میں ترکی کی اس کوشش کی کامیابی یا ناکامی کے گہرے اثرات نہ صرف اسلامی دنیا بلکہ یورپ پر بھی مرتب ہوں گے۔

نوٹ: جناب حاتم بازیان زیتونہ کالج، برکلی کیلیفورنیا، میں قانون اور تھیولوجی کے پروفیسر ہیں۔ وہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں لیکچرر بھی ہیں۔ وہ اسلامی قانون اور معاشرہ، امریکہ میں مسلمان، معاشرے اور ادارے، اور اسلاموفوبیا اور اسلام کی دگر سازی (othering) کی تحلیل جیسے اہم مضامین پڑھاتے ہیں۔ پروفیسر بازیان نے ۲۰۱۲ء میں "اسلاموفوبیا سٹری جرنل" کے نام سے ایک

ششماہی تحقیقی مجلہ بھی جاری کیا ہے۔ اپنے تعلیمی اور علمی کاموں کے ساتھ ساتھ، حاتم بازیان ترکی کے انگریزی روزنامے "صبح" کے لئے ہفتہ وار کالم بھی لکھتے ہیں۔ یہ مضمون روزنامہ "صبح" میں ۲۱ جولائی، سنہ ۲۰۱۶ء کو شائع ہوا۔ اس تحریر کو اس لنک پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

<http://www.dailysabah.com/columns/hatem-bazian/2016/07/21/on-military-coups-and-post-colonialism>